عالمِ بالا سے جونؔ ایلیا کا خط، پرویز ہود بھائی کے نام

(تحریر: عامر سیدین)

پرویز جانی،

مرزا نوشہ کے یہاں رات خوب محفل جمی۔ گفتگو یہ تھی کہ مسلمانوں نے بارہویں تیرہویں صدی تک علومِ پایہ یعنی سائنسی علوم کو جو دیا سو دیا، پھر وہ اس معاملہ میں بالکل خاموش ہو رہے۔ اب گفتگو کے شروع ہونے کا قصہ سنا دوں۔ کسی نے اپنی قرنیۂ چشم (cornea) کی از درع تعویضیا یعنی پیوند کاری یعنی جسے انگریزی میں ٹرانسپلانٹ کہتے ہیں، کا ذکر کیا۔ پھر بات دل، جگر، گردہ اور پھیپھڑوں کی پیوند کاری کی ہوئی۔ مجھے سردار بھائی یعنی علی سردار جعفری کا کرشمہ یاد آ۔ گویا ان کی منفرد نظم کرشمہ۔ پھر مجھے ان کا امام حسن کی حسین ترین حدیث اور سردار بھائی کا اسکا حسن جوئی میں بے حد بے ایمانی سے کیا ہوا ترجمہ جو اُن کے ایمان کی دلیل ہے، یاد آ گیا۔ تو کرّہِ ارض یعنی جہانِ فانی میں، کرشمہ سنانے سے پہلے انہوں نے یہ حدیث سنائی تھی کہ ''ان اللہ جمیل ویحب الجمال'' اور ترجمہ کیا کہ اللہ حسین ہے اور حسینوں سے پیار کرتا ہے۔ تیرے چچا کا کلیجہ ویسے ہی پھڑک اٹھا جیسے پہلی مرتبہ سن کے پھڑکا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو کہتا 'اور حسن سے پیار کرتا ہے'۔ میاں یہاں حسینوں سے پیار کرتا ہے کہہ کے سردار بھائی بات کو طبع شاعر کے وطن لے گئے۔ ہاں تو بس میں نے سردار بھائی سے فرمائش کی، مرزا نوشہ نے حکم دیا۔ تو سردار بھائی نے تقریباً لہکتے ہوئے یعنی بالکل اپنی منفرد وضع سے یہ نظم سنائی۔ تجھے لطف آئے گا، سو رقم کر رہا ہوں۔

مرے لہو میں جو توریت کا ترنم ہے
مری رگوں میں جو یہ زمزمہ زبور کا ہے
یہ سب یہود و نصاریٰ کے خوں کی لہریں ہیں
مچل رہی ہیں جو میرے لہو کی گنگا میں
میں سانس لیتا ہوں جن پھیپھڑوں کی جنبش سے
کسی مغنیِ آتش نفس نے بخشے ہیں
جواں ہے مصحفِ یزداں کا لحن داؤدی

کسی کی نرگسی آنکھوں کا نرگسی پردہ
مری نظر کو عطا کر رہا ہے بینائی
طلوعِ مہر کی ہیں نقش کاریاں کیا کیا
مہ و نجوم کی ہیں جلوہ واریاں کیا کیا
زمیں سے تا بہ فلک رقص میں ہیں لیلائیں
شگفتہ صورتِ گل ہر طرف تمنائیں

خدا کا شکر ادا جب زبان کرتی ہے
تو دل تڑپتا ہے اک ایسی کافرہ کے لئے
خدا بھی میری طرح جس سے پیار کرتا ہے
ہو جس میں نازِ یحب الجمال کا نغمہ
وہ سر سے پاؤں تلک ماہ و سال کا نغمہ
جلال ہجر و شکوہِ وصال کا نغمہ

جہانِ عشق میں تفریقِ اسم و ذات نہیں
جہانِ حسن میں تقسیمِ ہند و پاک نہیں
سوا گلوں کے گریباں کسی کا چاک نہیں

یہ عالمِ بشری، احترام کا عالم
تمام تر ہے درود و سلام کا عالم
نفس نفس میں مرے زمزمہ محبت کا
مرا وجود قصیدہ بشر کی عظمت کا
یہ سب کرشمہ ہے انسانیت کی وحدت کا
مری رگوں میں جو توریت کا ترنم ہے
مری نفس میں جو یہ زمزمہ زبور کا ہے

انسانیت کے ایک ہونے اور یہود و نصاریٰ سے جو مسلمانوں نے ان گزری صدیوں کے بعد حاصل کیا اسکا ذکر رہا۔ تقسیمِ ہندو پاک پہ گریہ وزاری ہوئی۔ اور بہت ہوئی۔ یہ بات پاکستان دشمنی کی نہیں بلکہ انسان دوستی کی ہے۔ اسے کوئی اور لبادہ اوڑھانا سرعاً وقطعاً، عمومی وخصوصی، زیادتی ہوگی۔ گفتگو بند نہ ہوئی اور بات سے بات چلی، شامِ ملاقاتی کی طولانی حسن خیال کو جلا دیتی رہی۔ بات یہاں آئی کہ اردو شاعری نے اقبال سے قبل تک علومِ پایہ سے کنارہ کشی رکھی۔ میاں یکدم ایک کونے سے میر کی آواز آئی کہ میں نے کہا تھا کہ:

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

مگر تم لوگوں نے ایک نہ سنی۔ غل مچائے جا رہے ہو۔ میں نے جو کوئی اڑھائی سو برس قبل کہا تھا وہ بھی نہیں سنا:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

میاں وہ بات کائنات اور اس کے اجزا کی وابستگی کی نہیں تھی تو کیا تھی؟ اب تمہیں معلوم ہوا کہ مویشیوں کی افزائش کے لئے جو ادویات استعمال کرتے ہو اس سے انسانی نمو پہ اثر پڑتا ہے۔ تم گوشت زیادہ کھانے کو گائیں زیادہ پالتے ہو، اس سے ماحول میں آلودگی بڑھتی ہے۔ مرزا نوشہ، میر سے متفق تھے۔ کہنے لگے کہ اب تو ریختہ اور اس کی استادی پہ ایسے چھینٹے پڑ رہے ہیں کہ خیال آ رہا ہے کہ مجھے کہنا یہ چاہیے تھا کہ:

سائنس کے تمہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

اب پھر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے کہ ایسی سخن ناشناس قوم سے پالا پڑا ہے۔ کہنا چاہئے تھا کہ:

کھولو ذرا یہ دیدۂ غفلت نگاہ کو
سمجھو مری جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

مگر اپنے دوست نواب مصطفٰے خان شیفتہ کا شعر یاد آ رہا ہے کہ:

اے اہلِ نظر ذرے میں پوشیدہ ہے خورشید
ایضاح سے حاصل بجز ابہام نہ ہوگا

انکا یہ شعر دو آتشہ ہے۔ پہلی بات یہ کہ یہ علومِ پایہ کی بات کر رہا ہے اور وہ کہہ رہا ہے جو آج کی دنیا جان رہی ہے، پرتیں کھل رہی ہیں، کائنات کے راز افشا ہو رہے ہیں اور ابہام جوں کا توں۔ دوسری بات میں یہ شعر مجھ سے مخاطب ہے کہ چاہے جتنی وضاحت کر لو ابہام ہی رہنا ہے۔ اسی غزل میں انہوں نے مجھے تسلی بھی دی ہے۔

ہم طالبِ شہرت ہیں، ہمیں ننگ سے کیا کام
بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

اور سن لو میاں، جس زمانے میں ڈارون جنوبی امریکہ تک سفر کر کے جزیرہ گیلاپیگوس جا کے ارتقا یعنی evolution کے نظریۂ قدرتی انتخاب (Theory of Natural Selection) کی بات کر رہا تھا، فدوی بلی ماراں میں گھر بیٹھا کہہ رہ تھا کہ:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

میاں اتنی بات کیوں نہیں سمجھتے کہ کسی ڈومنی کا ذکر ہوتا تو پیہم کہتا یعنی مستقل، یعنی ہمہ وقت، مگر کہا دائم یعنی ابدی یعنی آخرِ کائنات تک، تو ذکر کائنات اور زندگی یعنی حیات کا تھا۔ میں نے اس زمین میں دو غزلیں کہیں۔ پہلی:

کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

اور دوسری:

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

اول الذکر میں گفتگو فلسفیانہ تھی اور آخر الذکر میں گفتگو مجازی نہج پہ تھی۔ ڈومنی سے کلام ہوتا تو پیہم کہتا اور پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب کے ساتھ رکھتا۔

اقبال نے پھر میری بات کو اور واضح بیان کیا یعنی

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

میاں میں تو کہہ گیا تھا کہ

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

بوگس حیدر آبادی تو میری اصلاح بھی فرما گئے کہ

ناچتی پھرتی تھیں وہ جو کلب میں چند اک لڑکیاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

میاں میرا تخیل تو ستاروں سے آگے کے جہانوں میں تھا۔ اگر کسی کو اصرار ہے کہ نہیں تو نہ سہی۔ میں نے انگریز کو دیکھا اور اس کی ترقی کی وجہ سمجھی۔ میں تو علومِ پایہ کو ترقی کی بنیاد سمجھتا تھا اور سمجھتا ہوں۔ میں نے سچ کہہ کے سید احمد خان کی خفگی بھی مول لی۔ وہ آئینِ اکبری کی تصحیح انگریز کو پیش کر رہے تھے اور میں نے خلاصتہً ان کی فرمائش پہ لکھی تقریظ میں کہہ دیا کہ انگریز سے اس کے علومِ سیکھو۔ مجھے تو ترقی جدید علوم میں نظر آ رہی تھی۔ کئی برس وہ مجھ سے نہ ملے۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بنیادوں میں بلی ماراں کے اسد اللہ خاں غالب کے تخیل کا خون شامل ہے۔

میں نے کہا تھا۔ ترجمہ سمیت سناتا ہوں مگر میاں، جون کا نامہ بر تو میرے کئے ہوئے منظوم ترجمہ کو قلم نہیں کر پا رہا تھا بلکہ اس کا سر قلم کئے دے رہا تھا۔ عباس تابش نے ترجمہ کو منظوم کیا۔ ایسا نہ ہو کہ تابش کا حق جیتے جی ہی مار لے یہ چوٹّا۔ دعا ہے کہ پروردگار تابش یعنی استعداد یعنی براقی یعنی برق یعنی پرتو یعنی تاب یعنی تابندگی یعنی تب و تاب یعنی تشعشع یعنی یعنی جلا یعنی چراغ یعنی درخشش یعنی درخشندگی یعنی روشنی یعنی زیبائی یعنی زیرکی یعنی شکوہ یعنی شور عشق یعنی شعلہ یعنی فانوس یعنی فروغ یعنی گرمی گویا نور کو جہانِ فانی میں تا دیر بخیر و صحت مندر کھے اور اسے ایندھن بلا خست مہیا رہے۔ اب سن لو۔ فقط ترجمہ پڑھوں گا۔ تم تابش کو دعا دو۔

اینکہ در تصحیح آئین رائی اوست
ننگ و عارِ ہمت والائی اوست

(رائے ہے یہ تصحیح آئین میں
ہمتِ عالی کو اس کی ننگ ہے)

بر چنین کاری کہ اصلش این بود
آن ستاید کش ریا آئین بود

(کام کہ جسکی حقیقت ایسی ہو
وہ ستائش کرنے والا جھوٹا ہے)

گر بدین کارش نگویم آفرین
جائی آن دارد کہ جویم آفرین

(گر نہیں کہتا میں اس پہ آفریں
تو بجا ہوگا ملے جو مجھ کو داد)

کس مخر باشد بگیتی این متاع
خواجہ را چہ بود امید انتفاع

(کون لے گا جنس یہ برخا کداں
فائدہ کیا چاہتے ہیں یہ خواجگاں)

گر ز آئین می رود با ما سخن
چشم بکشا در درین دیرِ کہن

(پوچھتے آئین کا تو بولتا
آنکھیں کھولو اپنی تم اس دہر میں)

صاحبان انگلستان رانگر
شیوہ واندازِ اینان رانگر

(دیکھو انگلستان والوں کی طرف
شیوہ وانداز ان کا سمجھو سب)

تا چہ آئین ہا پدید آوردہ اند
آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند

(کیا کیا وہ آئیں بنا کر لائے ہیں
ہے جو ان دیکھا دکھانے لائے ہیں)

زین ہنرمندان ہنر بیشی گرفت
سعی بر پیشینیان پیشی گرفت

(ان ہنرمندوں سے فن حاصل کرو
ان پہ سبقت لینے کی کوشش کرو)

حق این قوم است آئین داشتن
کس نیارد ملک بہ زین داشتن

(حق ہے آئیں پر تو ان کی قوم کا
ملک ان جیسا جہاں میں کس کا ہے)

داد و دانش را بہم پیوستہ اند
ہند را صد گونہ آئین بستہ اند

(داد و دانش کو ملایا کیسا ہے
ہند کو قانون صد کیا بخشے ہیں)

آتشی کز سنگ بیرون آورند

این ہنرمندان زخس چون آورند

(ہم جلاتے ہیں یہاں پتھر سے آگ

اور خس سے وہ لگا لیتے ہیں آگ)—ماچس

تا چہ افسون خواندہ اند اینان بر آب

دود کشتی را ہمی راند در آب

(کیا عجب جادو کیا ہے پانی پہ

کہ دھوئیں سے کشتی ہو جاتی ہے تیز)— سٹیمر

گہ دخان کشتی بہ جیحون می برد

گہ دخان گردون بہ ہامون می برد

(گہ دھوئیں سے کشتی اپنی کھیتے ہیں

گہ دھوئیں سے ریل کو ڈھو لیتے ہیں)

از دخان زورق بہ رفتار آمدہ

باد و موج، ایں ن ہر دو بیکار آمدہ

(دھوئیں سے رفتار کشتی لیتی ہے

ہوتے ہیں بے بس جو دونوں، باد و موج)

نغمہ ہا بی زخمہ از ساز آورند

حرف چون طائر بہ پرواز آورند

(نغمہ گونجا تار کو چھیڑے بغیر

حرف طائر کی طرح پرواز میں)— گراموفون

این نمی بینی کہ این دانا گروہ
در دو دم آرند حرف از صد کروہ

(یہ نہیں دیکھا کہ یہ دانا گروہ
بھیجتا ہے بات کو سو کوس پر)— ٹیلی گراف

رو بہ لندن کاندران رخشندہ باغ
شہر روشن گشتہ در شب بی چراغ

(دیکھو لندن میں چمکتا ہے وہ باغ
نور سے پر شہر شب بھر بے چراغ)— بجلی کے بلب

کاروبار مردم ہشیار بین
در ہر آئیں صد نو آئین کار بین

(کاروبارِ مردمِ ہوشیار دیکھ
ہو گئے آئین میں صد کار دیکھ)

پیشِ این آئین کہ دارد روزگار
گشتہ آئین دگر تقویم پار

(آئیں ہے چلتا ہے جس سے روزگار
اور آئین دگر ہیں سب بکار)

چون چنین گنجِ گہر بیند کسی
خوشہ زان خرمن چرا چیند کسی

(دیکھے جب ایسا خزانہ گر کوئی
کہنہ خرمن کا ہو خوشہ چین کیوں)

مردہ پروردن مبارک کار نیست
خود بگو کان نیز جز گفتار نیست

(مردہ خواہی کب مبارک کار ہے
خود کہو تم یہ فقط گفتار ہے)

غالب، آئینِ خموشی دل کش است
گر چہ خوش گفتن، نگفتن ہم خوش است

(غالب آئینِ خموشی خوب ہے
خوب گو تم نے کہا، چپ خوب ہے)

یہ باتیں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی ہیں۔

یاد رہے کہ سید احمد سے میری گفتگو 1855ء کی ہے اور اینگلو اورئینٹل کالج علیگڑھ میں 1875ء میں قائم کیا گیا۔ اب اس میں میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

مرزا نوشہ یہ کہہ کے خاموش ہو گئے۔ میں نے ان کو چھیڑنا مناسب نہ سمجھا۔ گو کہ بات اگلے دور کی ہے جسمیں علامہ برطانیہ جا چکے تھے اور انکی شاعری کے علومِ پایہ کے اسرار کو میں اساتذہِ اردو کے اس موضوع پہ افکار سے علیحدہ تصور کرتا ہوں کیونکہ علامہ پہ انگریزی تعلیم کا اثر ہے۔ مگر بات اردو کی ہے اور زوردار ہے۔ برج نرائن چکبست فرماتے ہیں کہ:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

میاں مگر عناصر میں ظہورِ ترتیب یوں ہو کہ نتیجہِ آفرینش ڈاکٹر عبدالسلام ہو تو آفرین اس بنانے والے پہ اور علومِ پایہ نامی میدانِ کارزار کا نقشہ مرزا سلامت علی دبیر کے معرکۃ الآرا مصرع سے کھنچتا ہے کہ:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے

میاں کیا شیر تھا اور کیا اس کی وغا۔ کیا معرکہ مارے مگر ظالمو نے گھر میں وہ مقام نہ دیا جو کہ اس کا حق تھا اور ہے اور نہ اس بدقسمت قوم کو اس کے علم سے فیض حاصل کرنے دیا۔

1979ء میں، ڈاکٹر عبدالسلام اور اسٹیون وائنبرگ، دونوں علمائے پایہ یعنی سائنسدانوں کو ایک ساتھ طبیعیات یعنی physics کا نوبیل انعام ملا۔ دونوں نے انفرادی طور پہ ہگز بوسن (Higgs boson) نامی ایک دون الذرّی، ذرہ کے وجود کی پیشنگوئی کی تھی۔ اس ذرّہ کا نام برطانوی طبیعیات دان ہگز بوسن کے نام پر رکھا گیا تھا، جس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ ذرّہ، دوسرے ذرات کو کمیت یعنی mass بخشتا ہے۔ چونکہ اس کا وجود کائنات کے ابتدائی ارتقا کو سمجھنے کے لئے انتہائی اہم ہے، اس ذرّہ کو God Particle یا خدائی ذرّہ کہا جاتا ہے۔ مگر میں اس کا ترجمہ الوہی ذرّہ کروں گا۔ ڈاکٹران عبدالسلام اور وائنبرگ نے بنیادی ذرّات (basic particles) کے مابین مربوط (unified) کمزور (weak) اور برقی مقناطیسی (electromagnetic) تعامل (interaction) کے نظریہ کی اعانت کی جس کا ایک جز، ایک دوسرے کے ساتھ کمزور، غیر جانبدار، برقی بہاؤ (current) کی پیشگوئی (prediction) بھی تھی۔

خدا کرے کہ تو اپنے جہاد میں کامیاب ہو اور اس ملک میں نصاب کا اور بیڑا غرق نہ ہو۔

جانی، تُو اپنی جدوجہد جاری رکھ۔ تیری نہ یہ سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں۔ مگر تُو حق پہ ہے اور میں تو خیر کی امید باندھے بیٹھا ہوں، سو ''نصر من اللہ و فتح قریب''۔

یہاں آ کے میں مراسلہ نگاری، یعنی یہ مکالمہ، یعنی جنوں میں بکنا، موقوف کرتا ہوں۔ میاں مرزا نوشہ کی شان میں جہانِ فانی میں تو بساط سے بڑھ کے گستاخیاں کر چکا ہوں۔ مشکلوں سے یہاں تعلقات اچھے کئے ہیں۔ اب ان کی دلجوئی کو جاتا ہوں۔ ان کی علومِ پایہ کی ترویج اور ان موضوعات پہ ان کے اشعار پہ گفتگو کا سلسلہ جاری رہے گا۔

تیرے اور اس مملکتِ خداداد کے لئے دعا گو،
جونؔ ایلیا